ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.4,2023

مختیار مسعود کی کتاب "حرفِ شوق" کا تنقیدی جائزہ

*حافظ محمد عبدالقدوس

لیکچرار (اردو) گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج رائیونڈ، لاہور

ABSTRACT
Mukhtiar Masood is a unique prose writer in the world of literature. Mukhtiar Masood's expressive style is full of history and culture. Mukhtar Masood was brought up in such a revolutionary environment where he got the opportunity to acquire knowledge from the great teachers of the subcontinent and at the same time got the opportunity to see the great political and intellectual conditions of Pakistan and India. His life was enriched by this environment. Mokhtar Masood's father, Sheikh Attaullah, had great devotion to Allama Iqbal. He was a professor of economics, but he was an Urdu writer. The influence of Mukhtar Masood was that he had an emotional attachment to Urdu, Islam, Iqbal and Pakistan.
Key words: *Mukhtiar Masood, Emotional attachment, Economics, Enriched, Unique,*

"حرفِ شوق" کے خالق مختار مسعود 1926ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام شیخ عطاء محمد مرحوم تھا، جو کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں معاشیات کے پروفیسر تھے۔ مختار مسعود کی پرورش ایسے انقلابی ماحول میں ہوئی جہاں انھیں برصغیر کے عظیم اساتذہ سے اکتساب علمی کا موقع ملا اور اس کے ساتھ ساتھ پاک و ہند کے عظیم سیاسی و فکری حالات کو دیکھنے کا موقع حاصل ہوا۔ اس ماحول کے فیضان ان کی زندگی کا مقصد لگن اور تحریکی وابستگی سے عبارت ہوئی۔ مختار مسعود کے والد شیخ عطاء اللہ کو علامہ اقبال سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ پروفیسر تو معاشیات کے تھے لیکن ادیب اُردو کے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ والد کے ان علمی کاموں اور اقبال سے عقیدت کا اثر مختار مسعود پر یہ ہوا کہ وہ اردو، اسلام، اقبال اور پاکستان سے جذباتی وابستگی رکھتے تھے۔

"حرفِ شوق" کا اصل محرک یادِ رفتگاں کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اس کتاب میں مصنف نے ایسی شخصیات کا ذکر کیا ہے جو وفات پا چکی ہیں۔ یعنی "حرفِ شوق" مختار مسعود کی یادداشتوں کا حسین مرقع ہے۔ مختار مسعود نے "ماضی کے ساتھ ایک نشست" کے عنوان کے تحت اپنے ماضی کی یادوں کو صفحہ قرطاس پر اتارا ہے۔ ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے مختار مسعود بچپن سے جوانی کا ذکر کرتے ہیں۔ جنگِ عظیم دوم کے واقعات ان کی جوانی کے دور کے ایسے واقعات ہیں جنھوں نے ان کے ذہن پر اپنے تلخ نقوش پیوستہ کر رکھے ہیں جنھیں مختار مسعود نے "حرفِ شوق" کی صورت میں لفظوں کی شکل میں ڈھال دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دورانِ جنگ ہر چیز کی قلت ہو جاتی ہے اور صرف کھنڈرات میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن مختار مسعود کا جنگ کے حوالے سے تجربہ انوکھی نوعیت کا ہے۔ مختار مسعود لکھتے ہیں:

> "عام طور پر جنگ میں ہر کام کی چیز کی قلت ہو جاتی ہے۔ اضافہ صرف کھنڈرات میں ہوتا ہے۔ میرے لڑکپن کا تجربہ اس معاملہ میں دوسروں سے ذرا مختلف ہے۔ میں نے دوسری جنگِ عظیم کو ایک پائیدار کھنڈر کا صفایا کرتے دیکھا ہے جو میدانِ جنگ سے سینکڑوں میل دور واقع تھا۔ جنگ کے اثرات واقعی بڑے دوررس ہوتے ہیں۔ جنگ کو شروع ہوئے مشکل سے ایک سال ہوا ہو گا کہ چند نئے الفاظ ہماری زبان پر ایسے چڑھ گئے کہ ان کے بغیر کوئی بات مکمل ہی نہیں ہوتی تھی۔ ان میں دو لفظ بہت اہم تھے۔ جنگ کے سلسلہ میں فتح اور شکست اور عام زندگی کے بارے میں shortage اور inflation۔"(1)

ہر ادیب اور مصنف اپنے عہد کی ترجمانی کرتا ہے۔ اسی طرح مختار مسعود بھی اپنے عہد کے اہم مصنف تھے۔ آپ نڈر اور بے باک تھے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ معروف ادیبوں سے کم نہ تھا۔ "حرفِ شوق" کے پہلے دو مضامین ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ پہلا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.4, 2023

کے بارے میں ہے اور دوسرا سرسید کے بارے میں۔ پہلے مضمون کا عنوان "ماضی کے ساتھ ایک نشست" ہے۔ گویا اس کا زمان ماضی ہے اور مکان اسٹریچی ہال، جس کو مصنف نے سرسید کے علی گڑھ کی ایک علامت بنا دیا ہے۔ سرسید کا علی گڑھ ایک ادارہ ہی نہیں ایک تحریک تھا جس کے بطن سے پاکستان پیدا ہوا۔ مختار مسعود نے ماضی سے اپنی سنہری یادوں کو سمیٹتے ہوئے سرسید اور قائدِ اعظم سے متعلق واقعات کو درج کیا ہے۔ ان سب واقعات میں سب سے زیادہ علی گڑھ یونیورسٹی کا ذکر کیا گیا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی اور خاص طور پر اس میں موجود "اسٹریچی ہال" کا بار بار ذکر مختار مسعود کے ماضی کا درخشاں پہلو سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی ہال میں جب کہ وہ ابھی نامکمل تھا مسلم ایجوکیشن کانفرنس قائم ہوئی جس کے ایک سالانہ اجلاس میں مسلم لیگ بنی۔ اسی میں تحریکِ پاکستان کے دوران قائدِ اعظم نے یادگار سیاسی تقریریں کیں۔ اس کے بعد مصنف کی علامت بندی پر کون اعتراض کر سکتا ہے؟ اس ہال کا ذکر مختار مسعود نے بڑے مفصل انداز سے اس طور کیا ہے کہ قاری خود کو اس جگہ پر موجود پاتا ہے اور وہاں کے مناظر کو آنکھوں کے سامنے چلتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ مختار مسعود "اسٹریچی ہال" سے متعلق لکھتے ہیں:

> "وہ آئینہ خانہ جس میں مجھے سرسید کے علی گڑھ کی تاریخ اور اپنی ذاتی یادوں کے ان گنت عکس، دل کشی اور دل ربائی کے ہر زاویے اور پہلو سے نظر آتے ہیں اس کا نام اسٹریچی ہال ہے۔۔۔۔ اسٹریچی ہال عقلیت اور جدیدیت کی ادب گاہ ہے۔ تحریکِ علی گڑھ کا گہوارہ ہے۔ تحریکِ پاکستان کی رزم گاہ ہے۔ برطانوی ہند کے مسلمانوں کے مسائل کے تجزیے، حل کی تلاش اور دوررس نتائج کی حامل قراردادوں اور تجاویز کی تصدیق اور تصویب کا مقام ہے۔ یہ برعظیم کے مسلمانوں کے زوال سے عروج کی جانب سفر کی داستان ہے جو سنگ و خشت میں رقم کی گئی ہے۔"(2)

"سرسید احمد خاں کون تھے؟" کے مضمون کے تحت مختار مسعود نے سرسید سے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ بہت سے مخفی پہلوؤں کا اجاگر کیا ہے۔ یہ ایک تحقیقی مضمون ہے جس میں مختار مسعود نے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان میں سرسید کو کس حد تک یاد رکھا گیا ہے اور کس حد تک بھلا دیا گیا ہے؟ مختار مسعود نے سرسید سے متعلق بہت سے مثبت خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "میرا سرسید ایک غیر معمولی آدمی ہے۔ وسیع النظر اور ہمہ صفت موصوف۔ مصلح، دردمند، بیتاب اور ان تھک۔ انجمنوں اور اداروں کا بانی اور منتظم۔ مصنف اور مترجم۔ مفکر اور مؤرخ۔ پرانی عمارتوں کا قدرشناس، نئی عمارتوں کا معمار۔ تعلیم پھیلانے والا، سائنس کو خوش آمدید کہنے والا، صنعت و حرفت کی اہمیت کا قائل۔ توہمات کا دشمن، معقولات کا دوست۔ اپنی جھولی چندے سے بھرنے کا شوق اور اپنے اردگرد اچھے آدمی جمع کرنے کی صلاحیت رکھنے والا۔ راتوں کو اُٹھ کر مسلمانوں کے زوال پر آنسو بہانے والا۔ دنیاوی ترقی کا خواہاں اور دینی حمیت کی خاطر سیرت پر تحقیق کرنے کے لیے اثاثہ بیچ کر اور گھر رہن رکھ کر سات سمندر پار کا سفر کرنے والا۔ برعظیم کے مسلمانوں کی خاطر جدید انگریزی تعلیم اور انگریز راج بل کہ سامراج کو مفید سمجھتے ہوئے انگریزوں کی حفاظت کی خاطر جان پر کھیل جانے والا۔ انگریز کی سیاست اور طرزِ حکومت (دماکراسی) کو برعظیم کے لیے ناموزوں اور مسلمانوں کے لیے مہلک قرار دینے والا۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے سیاسی پارٹی کا کام لینے والا۔ میں تعلیم والے سرسید کے کمالات اور اوصاف میں ایسا کھویا کہ دوسرے سرسید سے تعارف کی دل میں خواہش پیدا ہوئی نہ زندگی میں کبھی اس کا موقع ملا۔"(3)

"سرسید احمد خاں کون تھے" کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں مختار مسعود نے بتایا ہے کہ پاکستان میں کس طرح سرسید احمد خاں کو یاد رکھا گیا ہے۔ کہیں ان کے نام کی عمارت بنی ہے تو کہیں رسائل کا تعلق سرسید سے ہے۔ کچھ انجمنیں ایسی ہیں جنھیں علی گڑھ کے اولڈ بوائز چلا رہے ہیں۔ یہاں مختار

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.4, 2023

مسعود نے ضیاء الدین لاہور کی تالیف "سرسید کی کہانی (1986ء) کا ذکر بھی کیا ہے۔ مختار مسعود نے سرسید سے متعلق مختلف لوگوں کی آراء کو شامل کیا ہے۔ کچھ لوگوں کے مثبت تاثرات کو بیان کیا اور کچھ کے منفی رجحانات بھی بیان کیے۔ ان کے مطابق لوگوں کا خیال ہے کہ اقبال اور سرسید سے بچ کر رہو جو انگریزی تعلیم حاصل کرنے والوں کے اعصاب پر سوار ہیں اور اس رویے کی مختلف وجوہات ہیں۔ مختار مسعود نے اپنے اس مضمون میں سرسید پر لکھی جانے والی تحاریر و مضامین اور خود سرسید کے لکھے مضامین کا ذکر بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"آہستہ آہستہ اور بغیر کسی منصوبہ بندی کے میرے پاس سرسید اور علی گڑھ تحریک کے بارے میں لکھی ہوئی کتابیں اور مضامین جمع ہوتے چلے گئے۔ یہ بھی جائزے کی نتیجہ خیزی تھی۔ مجھے اس کا یہ فائدہ ہوا کہ میں جس کسی سے سرسید کے بارے میں گفتگو کروں وہ اگر یہ معلوم کرنا چاہے کہ اسے موضوع پر کیا کچھ پڑھنا چاہیے تو مجھے مشورہ دینے میں کبھی دقت نہ ہوتی۔ بیشتر لوگوں کو یہ رائے دی کہ مولانا حالی نے سرسید کی جو سوانح حیاتِ جاوید کے عنوان سے لکھی ہے وہ اس کا پہلا حصہ پڑھ لیں۔ مولانا حالی کمال کے آدمی تھے۔ مجھے کسی ایک شخص نے بھی آکر یہ نہیں کہا کہ حیاتِ جاوید تو میرے کام کی سوانح نہیں نکلی، کیا آپ اس کی جگہ کوئی اور کتاب تجویز کرسکتے ہیں۔۔۔" (4)

اس مضمون کے دوسرے باب میں مختار مسعود نے ابنِ خلدون سے متعلق کچھ تفاصیل بیان کی ہیں۔ کہیں اپنے ماضی اور کہیں برطانوی سامراج کا ذکر کرتے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے ترقیاتی کاموں سے متعلق معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ ساتھ ہی رچرڈ اسٹریچی کے کاموں کو بیان کیا ہے۔ اسٹریچی نے اپنے بھائیوں کے ساتھ ساتھ ایک منہ بولے بھائی یعنی سرسید احمد خاں کا ذکر کیا ہے۔ اسٹریچی ہر جگہ سرسید کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے اور اس بات پر فخر محسوس کرتے تھے کہ سرسید ان کے دوست تھے۔ مختار مسعود نے سرسید اور ان کے کام سے متعلق لکھا ہے کہ:

"سرسید ایک بلند کردار انسان تھے۔ روشن خیال اور روشن دماغ شخص تھے۔ انھیں یقین تھا کہ اگر برعظیم کے مسلمان جدید مغربی تعلیم بالخصوص سائنسی علوم اور تکنیکی فنون سے محروم رہیں گے تو ان کا کوئی سیاسی، معاشی اور معاشرتی مستقبل نہیں ہے۔ اسلام پر سرسید کا یقین کامل اور پُر خلوص تھا۔ اس نے اپنے تن، من اور دھن کو جدید تعلیم کے فروغ کے لیے وقف کر دیا۔ اُن کا مدرسہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک مثالی ادارہ بن گیا۔ 1883ء میں انڈین ایجوکیشنل کمشنرز نے اس رائے کا اظہار کیا کہ بعض معاملات کے لحاظ سے یہ ادارہ جس کے بانی سرسید احمد خاں ہیں، ہندوستان کے تمام تعلیمی اداروں سے افضل ہے۔" (5)

"سرسید احمد خاں کون تھے" کے مضمون میں مختار مسعود نے تیسرے باب میں علی گڑھ کا حدود اربعہ بیان کیا ہے اور اس ادارے کے مقاصد کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ سرسید کے علمی کارناموں کے ذکر سے پہلے مختار مسعود نے مسلمانوں کے سیاسی زوال کے اسباب اور واقعات بیان کیے ہیں۔ یوں مختار مسعود نے ماضی اور حال دونوں کو ساتھ ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مسلمانوں کے روبہ زوال سے متعلق لکھتے ہیں:

"اُن دنوں مسلمانوں کی اجتماعی کیفیت کے تین عنوان تھے۔ صدمہ، مایوسی اور فرار۔ صدمہ اس امر کا کہ جہاں کل تک ہمارا سکہ چلتا تھا وہاں آج ہمیں کوئی جینے کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ مایوسی کا تعلق زمین کے سخت اور آسمان کے دور ہونے کا تھا۔ نئی حکومت کی نظر میں مسلمان باغی اور ناقابلِ اعتبار تھے۔ پرانی رعایا پرانے زخم کریدتی اور گنتی تھی۔ فرار کے علاوہ خاص و عام کو کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ فرار کی کئی صورتیں تھیں۔ بے غیرت ہو کر غلامی کی ذلت کو برداشت کرنا، تقدیر سمجھ کر حالات کو قبول کرلینا، لاتعلق ہو جاتا، مذہب کی خاطر جان پر کھیل جانا یا دارالحرب سے ہجرت

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.4, 2023

کرنا۔اس آخری اختیاری تدبیر پر سرسید نے بھی سنجیدگی سے غور کیا تھا۔بیاحافظہ کہ ماخودرابملک دیگر اندازیم۔وہ پنشن لے کر مصر میں آباد ہوناچاہتے تھے۔"(6)

مختار مسعود نے مسلمانوں کے زوال کاذمہ دار ایسٹ انڈیا کمپنی کو قرار دیا ہے جو کہ بہت بڑی حقیقت بھی ہے۔اس سلسلے میں مختار مسعود نے سرسید کے خیالات کو بھی واضح کیا ہے۔سرسید نے مسلمان نوابزادوں،شاہزادوں اور اعلیٰ نسب والوں کی پستی کا جس طرح ذکر کیا،مختار مسعود نے اپنے مضمون میں اسے شامل کیا ہے۔مختار مسعود سرسید کے خیالات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سرسید نے مسلمانوں کے ادبا کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کے پیشِ نظر اس بات کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا کہ مسلمانِ برصغیر میں پھر کبھی عزت پائیں گے۔اپنے اور پرائے سبھی مسلمانوں کے مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے۔سرسید نے تہذیب الاخلاق میں لارڈ ھابرٹ،گورنر مدارس کے انتقال پر جو تعزیتی تحریر لکھی تھی اس میں ایک جملہ برعظیم کے مسلمانوں کے تنزل کی نوعیت،رفتار اور انجام کے بارے میں ہے جسے نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:"ہمارے ایک دوسرت کا مقولہ ہے کہ اچھالا ہوا پتھر جب نیچے گرنا شروع ہوتا ہے تو بیچ میں کہیں نہیں تھمتا،زمین ہی پر آکر ٹکراتا ہے۔اسی طرح مسلمانوں کا حال ہے کہ ان پر ادبار آیا ہے۔ان کا تنزل شروع ہوا ہے اب کوئی ان کو تھام نہیں سکتا۔وہ ضرور تحت الثریٰ کو پہنچیں گے۔اگرچہ ہم اپنے دوست کی بات تو نہیں مانتے مگر آثار ایسے ہی دکھائی دیتے ہیں۔"(7)

مختار مسعود نے بتایا ہے کہ جدید تعلیم سے کس طرح ہندوؤں نے فائدہ اٹھایا اور اس تعلیم کی وجہ سے ان کی اپنی شناخت بن گئی۔اس سلسلے میں مختار مسعود نے مختلف ہندو رہنماؤں کے نام بتائے ہیں جنھوں نے انگریزی تعلیم کے حصول اور قیام کے لیے محنت کی۔مختار مسعود بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کے لاپرواہی کی وجہ سے غدر کا سارا الزام انھی کے سر پر آگیا۔یہاں مختار مسعود نے سرسید کے ایک خط کا ذکر کرتے ہوئے سرسید اور ان کے خاندان پر کیے جانے والے مظالم کا ذکر بھی کیا ہے۔لکھتے ہیں:

"مسلمانوں نے انیسویں صدی کے پہلے پچاس سال پدرم سلطان بود کے نشے میں گنو دیئے،اس کے بعد غدر کا سارا الزام اپنے سر لے لیا۔سرسید نے بدرالدین طیب کو ایک خط میں لکھا:"غدر کیا ہوا۔ہندوؤں نے شروع کیا مسلمان دل جلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے۔ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہو گئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔"سرسید کے ماموں اور ماموں زاد بھائی انگریزی فوج نے دہلی میں مار دیئے۔والدہ اور خالہ نے نوکروں کے گھروں میں چھپ کر جان بچائی۔سرسید کی والدہ کو میرٹ لے گئے جہاں وہ نیم جان چند ہفتوں سے زیادہ زندہ نہ رہیں۔اس زمانے کے بارے میں سرسید نے لکھا ہے:"یہ بدبختی کا وہ زمانہ ہے جو سنہ 57ء و سنہ 58ء میں ہندوستان کے مسلمانوں پر گزرا۔کوئی آفت ایسی نہیں جو اس زمانے میں ہوئی اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی۔۔ان دنوں جو میری نگاہ سے انگریزی اخبارات کثرت سے گزرے اور جو کتابیں اس ہنگامے کی بابت تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں،تو ہر ایک میں یہی لکھا کہ ہندوستان میں مفسدِ اور بدذات کوئی نہیں مگر مسلمان!مسلمان!مسلمان!کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں اگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا۔"(8)

مذکورہ مضمون کے باب نمبر 5 میں مختار مسعود نے تعلیمی صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے مختلف واقعات کو پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مختلف لوگوں نے تعلیم سے متعلق مختلف آراء پیش کیں۔ کسی نے کہا کہ مذہبی تعلیم ضروری ہے، کسی نے کہا کہ سب ہندو تعلیم حاصل کریں، کسی نے آریا سماج تحریک کو فروغ دیا تو کسی نے اسلامی اداروں کو تعلیم کی بنیاد قرار دیا۔ اس سلسلے میں مختار مسعود نے مختلف لوگوں کے نام اور ان کے کام بھی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ مولانا سید احمد بریلوی کا ذکر بھی کیا ہے جنھوں نے جہاد کو فروغ دیا۔ یہاں مجاہدین کے کارناموں اور ناکامیوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ مختار مسعود لکھتے ہیں کہ یہاں انھیں ایک سیاح بننا پڑا اور مختلف علاقوں میں جانا پڑا۔ اس باب میں انھوں نے مجاہدین اور سکھوں کے درمیان لڑائیوں کے حوالے سے بہت سے معلومات فراہم کی ہیں۔

مختار مسعود اسی عنوان کے تحت باب 6 میں انھوں نے دو اشخاص امیر علی اور وزیر علی سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔ ایک کا تعلق ابتدائی زمانے سے تھا جب انگریز برعظیم میں داخل ہو رہے تھے اور دوسرے کا تعلق آخری دور سے تھا جب انگریز یہاں سے جا رہے تھے۔ وزیر علی کی خدمات اور امیر علی کی علمی فضیلت کو بیان کیا ہے۔ امیر علی نے اپنی سوانح میں سرسید سے متعلق بھی بہت سی معلومات لکھی ہیں۔ باب نمبر 7 میں مختار مسعود نے، سرسید نے جو تعلیمی خدمات انجام دیں اور اس دوران انھیں جو جو تکالیف اور مخالفتیں سہنا پڑیں، ان کا تذکرہ کیا ہے۔ مختار مسعود لکھتے ہیں کہ سرسید کا جدید تعلیم کا مشورہ ان کی مخالفت کا سبب بنا۔ اس مخالفت میں سب سے بڑا نام جمال الدین افغانی کا ہے۔ مختار مسعود لکھتے ہیں:

> ”سرسید کی بدقسمتی میں ایک نئے عنصر کا اضافہ اس طرح ہوا کہ جمال الدین افغانی ذاتی طور پر ان کی مخالفت بلکہ دشمنی پر اتر آئے۔ جمال الدین افغانی نے حیدر آباد دکن کے قیام کے دوران ردِ نیچریت کے عنوان سے ایک رسالہ تحریر کیا۔ سرسید کی سوچ کا خوب مذاق اڑایا۔ اس کے بعد کوئی پندرہ برس تک وہ یورپ اور ایران میں پھرتے رہے مگر سرسید کا پیچھا کرنے کے ”مقدس فرض“ کو فراموش نہیں کیا۔ گاہے گاہے اس کے خلاف مضمون لکھتے رہے۔ اس سلسلہ میں ان کا مضمون ”الدہریون فی الہند“ بہت مشہور ہے۔ جمال الدین افغانی نے اس مضمون میں سرسید کو بہت برا بھلا کہا ہے۔“(9)

مختار مسعود نے اسی عنوان کے تحت باب 8 میں سرسید کے تفسیری اجتہاد سے متعلق اپنے ذاتی تجربہ کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ سرسید کے کسی بھی دوست نے کبھی سرسید کے مذہبی خیالات پر گفتگو نہیں کی۔ علی گڑھ کے کسی طالب علم نے کبھی اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا نہ بولا۔ سرسید کے رفقا میں سے کسی ایک نے بھی کبھی سرسید کی تفسیر کی حمایت نہیں کی۔ بہت سے ساتھیوں نے اس تفسیر کی وجہ سے سرسید کا ساتھ چھوڑ دیا اور ان پر کفر کے فتوے لگانے شروع کر دیئے۔ اس سب مخالفت کے دوران سرسید نے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا، انھیں مختار مسعود نے یوں بیان کیا ہے:

> ”جہاں تک اجتہاد کا تعلق ہے سرسید نے اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے کہا تھا: ”اے میرے دوستو! میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ میری تحقیق ہے وہی صحیح ہے۔۔۔۔ میری نیت خاص خدا کے ساتھ ہے۔ اگر میں نے برا کیا ہے وہ چاہے گا معاف کرے گا، چاہے گا نہ کرے گا۔ اگر میں نے اچھا کیا ہے تو میں اس کا صلہ کسی بندہ سے نہیں چاہتا اور یہی وجہ ہے کہ نہ میں لوگوں کے کافر یا نیچری کہنے سے ڈرتا ہوں اور نہ برا مانتا ہوں جو لوگ میری ان کوششوں کے سبب برا کہتے ہیں، کافر بتلاتے ہیں، میں ان سے اپنی شفاعت کا خواستگار نہیں ہوں اور نہ ہوں گا، جو بھلا یا برا میرا معاملہ ہے، وہ خدا کے ساتھ ہے۔ اگر مجھ سے کچھ غلطی ہوئی یا آئندہ ہو گی، خدا سے مجھے امید ہے کہ وہ مجھ پر رحم کرے گا۔“(10)

اسی عنوان کے تحت باب 9 میں مختار مسعود نے سرسید کی صد سالہ برسی کا ذکر بھی کیا ہے۔ مختار مسعود بتاتے ہیں کہ سرسید کی برسی پر انھوں نے سرسید کے تمام مضامین، مقالات، مکتوبات اور خطبات کو دوبارہ پڑھا۔ یہاں سرسید سے متعلقہ بہت سے واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ مختار مسعود نے

سر سید کے خطوط سے متعلق بھی معلومات فراہم کی ہیں اور ان سے بہت سے واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ سر سید کے خطوط کا ذکر کرتے ہوئے مختار مسعود لکھتے ہیں:

"سر سید کے خطوط پڑھتے ہوئے میں نے سوغات کی تلاش ہی نہیں کی۔ ان کے دو جملے مجھے بہت پسند ہیں اور اس قسم کا تیسرا جملہ ان کے خطوط میں شاید ہی مل سکے۔ پہلا وہ جملہ ہے جو انھوں نے 10 جون 1879ء کے خط میں شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کے نام لکھا تھا: "جب خدا پوچھے گا کہ کیا لایا؟ میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔" جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے سر سید کا اصل خط بچپن میں علی گڑھ کی ایک ادبی نمائش میں دیکھا تھا۔ سر سید کا دوسرا مشہور جملہ وہ ہے جو انھوں نے اپنے دوست زین العابدین کے علی گڑھ سے چلے جانے پر لکھا تھا کہ صبح سویرے نیند سے بیدار ہونے پر اللہ نہیں بلکہ پہلے تم یاد آتے ہو۔" (11)

مختار مسعود نے باب 10 کے تحت سر سید سے متعلق لکھا ہے کہ بہت سی شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کے مخالفت بھی کی جاتی ہے اور ان کے حق میں بھی لکھا جاتا ہے۔ سر سید بھی ایک ایسی شخصیت ہیں جن سے متعلق متضاد نظریات پائے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مختار مسعود نے بہت سے ایسے تحریری سرمائے محفوظ رکھے جو سر سید کے حق میں تھے۔ سر سید کی مختلف تقاریر کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ باب 11 میں مختار مسعود نے نیشنلزم پر بحث کی ہے۔ یہاں اقوامِ متحدہ، قائدِ اعظم، بنگلہ دیش کے قیام جیسے عنوانات کو زیرِ بحث لاتے ہوئے پھر علی گڑھ کا تذکرہ چھیڑتے ہیں۔ مدرستہ العلوم کے بعد ایم۔ اے۔ او کالج کے قیام کا تذکرہ ملتا ہے۔ علی گڑھ سے پڑھنے والے چند ایسے لوگوں کا ذکر ملتا ہے جو سر سید کے دوستوں میں سے تھے۔ مختار مسعود لکھتے ہیں:

"سر سید نے ساری زندگی ایک بے تعصب، وسیع المشرب اور انسان دوست شخص کی حیثیت سے گزاری۔ وہ تمام اہلِ وطن کو رنگ، نسل، زبان اور مذاہب کے اختلاف کے باوجود اپنا بھائی کہتے اور ان سے بھائیوں والا سلوک روا رکھتے۔ سر سید نے اپنے پوتے کی تسمیہ خوانی کے موقع پر کہا تھا کہ گو میں نے اس وقت قوم کا ہی گیت گایا ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت اور برادرانہ محبت نہیں ہے۔ ہم اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی اپنے عزیزوں سے۔ سر سید نے جو کچھ کہا اس کا عملی ثبوت سب کو نظر آرہا ہے۔ پوتے کے نام میں ایک انگریز کا نام شامل تھا اور وہ تقریب کے دوران ایک ہندو بزرگ کی گو میں بیٹھا ہوا تھا۔ کسی نے اس صورت حال پر کیا اچھا طنز کیا ہے کہ سر سید کے یہاں قول و فعل کا تضاد پایا جاتا ہے۔ قول کے اعتبار سے وہ دو قومی نظریے کے مبلغ تھے اور فعل کے حوالے سے وہ متحدہ قومیت کے ایک معتبر اور شایانِ شان نمائندے نظر آتے ہیں۔" (12)

مختار مسعود نے باب 12 میں سر سید کی وفات اور اس کے بعد کے چند واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ جن میں 30 دسمبر 1906ء میں ہونے والی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بیسویں اجلاس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس اجلاس میں ہونے والے تقریب اور تقاریر کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ سر سید کے نظریات کا اثر ان کی وفات کے بعد نظر آتا ہے لیکن تحریکِ پاکستان کے کسی جلسے میں بھی کبھی سر سید کے نام کا نعرہ نہیں لگا۔ برِ عظیم میں جدوجہدِ آزادی کا زمانہ سر سید کی وفات کے بعد ہی شروع ہوا۔ باب 13 میں مختار مسعود نے ایک کتاب "ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان انڈیا" جو کہ چار جلدوں پر مشتمل ہے، کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب میں عالمگیر اورنگ زیب سے متعلق ایک دو واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ تاراچند کے نظریات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ تاراچند سے مختار مسعود کی ملاقات علی گڑھ یونیورسٹی میں ہسٹاریکل کانفرنس میں ہوئی۔ اس سلسلے میں انھوں نے موجد ار کا سر سید سے متعلق تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ مختار مسعود نے

مختلف کتب اور اشخاص کا ذکر کرتے ہوئے سر سید کے بارے میں ان کے خیالات کا ذکر کیا ہے۔ اس مضمون کے اختتام پر مختار مسعود نے سر سید کے حوالے سے پیش کیے جانے والے نظریات کا خلاصہ بیان کر کے اس مضمون کو سمیٹا ہے۔

"باعثِ تحریر" مختار مسعود کی کتاب "حرفِ شوق" کا تیسرا مضمون ہے۔ اس مضمون میں مختار مسعود نے پروفیسر ریاض الرحمٰن خان شروانی سے متعلق بیان کیا ہے جنھوں نے بچوں کے رسالہ کے مدیر کے نام ایک خط لکھا تھا۔ مدیر نے وہ خود وضاحت کے لیے مختار مسعود کو بھیجا۔ مختار مسعود لکھتے ہیں کہ انھوں نے اس خط کی مختصر وضاحت لکھی مگر وہ اتنی مختصر نہیں تھی جتنا انھوں نے سوچا تھا۔ ریاض الرحمٰن نے مختار مسعود سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا جسے مختار مسعود نے مختصراً بیان کیا ہے۔ ریاض الرحمٰن کا خط پڑھ کر مختار مسعود نے بہت کچھ خود سے متعلق جان لیا۔ اردو نثر لکھنے کے اسباب میں انھوں نے والد نے نصیحت کا ذکر کیا ہے۔ والد کی نصیحت ایک ساتھ نہیں بل کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تھی۔ ابوالکلام آزاد کی کتابیں شوق سے پڑھتے تھے۔ مختار مسعود نے ابوالکلام آزاد سے متعلق بہت سی معلومات بیان کی ہیں۔

اسی عنوان کے تحت باب 2 میں مختار مسعود نے اپنے گھریلو تعلیمی ماحول سے متعلق بیان کیا ہے۔ ان کے گھر میں کتابیں ہر جگہ پھیلی ہوتی تھیں۔ ان کتابوں میں لڑکیوں کی رہنمائی سے متعلق بھی کتابیں تھیں جو مختار مسعود کے زیرِ مطالعہ رہیں۔ کبھی مردوں کی بے وفائی سے متعلق ناول پڑھے اور ان کا دل پر بہت اثر لیا۔ مختار مسعود نے ایک ناول "شمیم" کا تذکرہ بھی کیا ہے جس کے مصنف فیاض علی تھے۔ اس ناول کے تذکرے سے انھوں نے فیاض علی کے عہدے اور پھر ادا جعفری سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔ پھر فیاض علی کے دوسرے ناول "انور" کا ذکر کیا ہے۔ باب 3 کے عنوان سے مختار مسعود نے ریاض خیر آبادی اور خواجہ حسن نظامی کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے مولانا عبدالماجد دریا بادی کی ایک کتاب کا تذکرہ کیا ہے۔ عبدالحلیم شرر، مہدی آفادی، نذیر احمد، مرزا عظیم بیگ چغتائی کی مختلف کتب کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

"باعثِ تحریر" کے عنوان کے تحت باب 4 میں مختار مسعود لکھتے ہیں کہ مختلف کتب کے مطالعہ سے انھیں بہت فوائد حاصل ہوئے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان کے والد کی نصیحت کے بہت سے فوائد ہوئے۔ مختار مسعود لکھتے ہیں کہ ان کے والد کی نصیحت کے مطابق انھوں نے بہت سے کتب کا مطالعہ کیا۔ 1946ء کے دور کو یاد کرتے ہوئے مختار مسعود نے لکھا ہے کہ ان کے بی۔ اے کے امتحان کے دن بڑے کٹھن تھے۔ پھر وہ ابوالکلام آزاد کا دوبارہ تذکرہ کرتے ہوئے ان سے متعلق معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے آزاد کی کتاب "غبارِ خاطر" کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

باب 5 کے تحت مختار مسعود نے تیسرے محرک یعنی کنواں سے متعلق لکھا ہے۔ جب مختار مسعود ابتدائی جماعتوں میں پڑھتے تھے تب کے واقعات بیان کیے ہیں۔ اساتذہ کے لیے مکانات بنانے کے سارے عمل کو بیان کیا ہے۔ مختلف شخصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے نئے بنائے گئے گھروں اور ارد گرد کے ماحول کو بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح مختلف مکانات اور گھروں کا تذکرہ کرتے ہوئے مختار مسعود نے ایک کنواں کا ذکر بھی کیا ہے۔ جہاں مختار مسعود بیٹھ کر رات کے وقت اپنے ماضی کی یادوں کو تازہ کرتے تھے۔ ان یادوں میں علی گڑھ یونیورسٹی سے لے کر سر سید اور پھر اپنی جوانی کے دن شامل تھے۔ یہاں مختار مسعود نے مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ان اساتذہ کو کنویں سے تشبیہ دی ہے۔ لکھتے ہیں:

> "مسلم یونیورسٹی کے نامور اساتذہ سب بڑے گہرے اور پُر آب کنویں تھے۔ کسی کنویں پر میں نے اوک لگا کر پیاس بجھائی۔ کسی سے دو چار ڈول پانی لیا، کسی سے دس بیس۔ چند کنویں ایسے بھی تھے جن سے میں نے ڈول کی بجائے چرس بھر کر پانی لیا اور کشتِ آرزو کو خوب خوب سیراب کیا۔ آرزو کی بہت سی جہتیں تھیں۔ ایک چرس پانی میں نے اس کنویں سے بھی لیا جس کی منڈیر پر بیٹھ کر ایک بار میں نے اردو نثر کی خدمت کا خواب سرِ شام دیکھا تھا۔ وہ کنواں رشید احمد صدیقی کے گھر کی زمین میں واقع تھا۔ انھوں نے دیوار کو خم دے کر اس کنویں کو گھر کے باہر کی جانب رکھا تا کہ بلا روک ٹوک ہر کوئی اپنی پیاسی آرزوؤں کو سیراب کر سکے۔ بہت سے نوجوانوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ میں ان میں

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.4, 2023

سے ایک ہوں۔ یہ بات میں آل احمد سرور کو کیسے سمجھاتا۔ چپ بیٹھا رہا۔ گفتگو کی بند گلی سے باہر نکلنے کا راستہ چپ شاہ کا روزہ رکھنے سے کھل جاتا ہے۔"(13)

باب 8 میں مختار مسعود نے اپنی ملازمت کی روداد لکھی ہے۔ ملازمت کے دوران انھیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ اسی دوران انھوں نے لندن میں قیام بھی کیا۔ لندن میں جن شخصیات سے ملاقات ہوئی اور ان کی جو مصروفیات تھیں سب کا بیان کیا گیا ہے۔ باب 9 میں مختار مسعود نے آزادی کے بعد کے حالات بیان کیے ہیں۔ سول سروس میں آنے والے افراد کی روداد اپنی زبانی سنائی ہے۔ ملازمت کے دوران مختار مسعود کا تبادلہ مختلف اضلاع میں ہوتا رہا جن کا ذکر مختار مسعود نے اس مضمون میں کیا ہے۔ باب 10 میں انھوں نے ابو الفضل سے متعلق اپنی یادوں کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے ساتھ گزرے وقت کے چند واقعات شامل کیے ہیں۔ باب 11 میں مختار مسعود نے سول سروس کے دوران تربیتی پروگرام کا تفصیلاً ذکر کیا ہے اور دورانِ تربیت ساتھ رہنے والے چند اشخاص کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ اس مضمون کے اختتام پر مختار مسعود وقت سے متعلق دلچسپ خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وقت ایک قوت ہے اور عمر ایک مہلت ہے۔ قوت صرف کرنے سے بڑھتی ہے۔ اس کا ذخیرہ نہیں ہوتا۔ جو بچ گئی وہ ضائع گئی۔ عمر کا بھی کچھ یہی حال ہے۔ متواتر عمل سے زندگی دراز تو ہو جاتی ہے۔ بے عمل کی عمر سو برس بھی ہو تو گویا پل بھر کیا۔ زندگی کو آزمائش کہتے ہیں۔ یہ عمل کے لیے دائرہ کار اور صحیح وقت کے انتخاب کی آزمائش ہے۔ دنیا کے کام بے شمار۔ کبھی ختم ہونے میں نہیں آتے۔ کارِ دنیا کسے تمام نکرد۔ ہر شخص کو یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ وہ زندگی میں کون کون سا کام کرے گا اور کیسے کیسے لاتعداد اچھے کام چھوڑ دے گا۔۔۔۔۔ قلم رکھے رکھے ناکارہ ہو گیا ہے۔ انگلیاں قلم کو گرفت میں لینے کا ہنر فراموش کر چکی ہیں۔ وہ بے یقینی کے عالم میں لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک جملہ بھی مکمل نہیں ہوتا کہ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ تاریکی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو جاتا ہے۔ گھپ اندھیرے میں کبھی کسی دانا بینا کو راستہ ملا ہے جو اندھے کو ملے گا۔"(14)

باب 12 میں مختار مسعود نے اردو نثر کے آغاز و ارتقاء سے متعلق تفصیل سے بیان کیا ہے۔ باب 13 میں انھوں نے فورٹ ولیم کالج سے متعلق ذکر کیا ہے۔ اردو نثر کے حوالے سے فورٹ ولیم کالج کے طالب علم اور اساتذہ کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی ہیں۔ مختار مسعود کو فورٹ ولیم کالج سے جو شکایات تھیں ان کو بھی کھل کر بیان کیا ہے۔ باب 14 میں اسلوبِ نثر کا تذکرہ کرتے ہوئے فسانۂ عجائب اور خطوطِ غالب سے متعلق بتایا ہے۔ نثر نگاروں کی فہرست میں مختار مسعود نے سر سید احمد خاں کا ذکر بھی کیا ہے۔ جنھوں نے آثار الصنادید جیسی کتاب لکھی۔ اس باب میں مختار مسعود نے اردو نثر کے تین ادوار بیان کیے ہیں۔ اس دور کے آخر نثر نگار رشید احمد صدیقی کا ذکر بھی کیا ہے۔ پاکستان کے انشاپردازوں کو مختار مسعود نے دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ گروہ جو آزادی سے پہلے لکھ رہے تھے اور آزادی کے بعد پاکستان کے حصے میں آئے۔ دوسرا وہ گروہ جس نے آزادی کے بعد لکھنا شروع کیا۔ ان دونوں گروہوں کے چیدہ چیدہ مصنفین کے نام بھی دیے گئے ہیں۔ باب 15 میں مختار مسعود نے ادبیاتِ عالم کے پہلے نثر نگار یعنی ہیروڈاوٹس کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔ ہیروڈاوٹس کی نثر سے متعلق مختار مسعود نے لکھا ہے:

"ہیروڈوائس کی نثر کی خوبیوں کی مختصر فہرست کچھ اس طرح ہے۔ سلاست، روانی، روشنی، راستی، اعتدال، ہمواری، لطافت اور زیبائی۔ نثر کی خوبی اور خرابی کے کئی معیار ہیں۔ ایک معیار یہ ہے کہ اگر آپ کسی عبارت سے کوئی لفظ حذف نہ کر سکیں یا کسی لفظ کا اضافہ نہ

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.4,2023

کر سکیں تو وہ بے عیب کمال پذیری کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ہیروڈاوٹس کی نثر اس معیار پر پورا اترتی ہے۔"(15)

مختار مسعود مرحوم نسیم انصاری کو خط لکھنے کی وجہ بھی خود سے سوال کر کے خود ہی جواب کی صورت میں دیتے ہیں۔ وہ نسیم انصاری کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ایسی شخصیت ہیں جو دنیا میں جس طرح رہتے تھے امید ہے کہ بعد از موت بھی ویسے ہی شاہانہ زندگی گزار رہے ہوں گے۔ مختار مسعود نے لکھا ہے کہ نسیم انصاری کو غزالی سے کچھ اعتراضات تھے۔ پھر انھوں نے غزالی کے حیات بعد الممات سے متعلق خیالات کو آٹھ نکات کی صورت میں بیان کیا ہے۔ نسیم انصاری مرحوم نے مختار مسعود کی کتاب "آوازِ دوست" کے جواب میں "جوابِ دوست" کتاب لکھی۔ جس کا حوالہ مختار مسعود نے اس خط میں بار بار دیا ہے۔ نسیم انصاری نے اپنی کتاب کا انتساب بھی مختار مسعود کے نام کیا۔ مذکورہ خط مختار مسعود نے نسیم انصاری مرحوم کا شکریہ ادا کرنے کے لیے لکھا ہے۔ مختار مسعود نے "آوازِ دوست" اور "جواب دوست" میں فرق بھی واضح کیا ہے۔ "آواز دوست" علی گڑھ کے مدرسہ سے شروع ہو کر بر عظیم کی آزادی پر ختم ہوتی ہے جب کہ "جوابِ دوست" علی گڑھ کے علاوہ لکھنؤ، کلکتہ، لندن اور بن غازی بھی شامل ہیں۔ مختار مسعود لکھتے ہیں:

"آواز دوست اور جوابِ دوست میں ایک واضح اور بنیادی فرق ہے۔ آوازِ دوست علی گڑھ کے مدرسہ سے شروع ہو کر بر عظیم کی آزادی پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا محور اور مرکز تحریک پاکستان اور اس زمانے کا علی گڑھ ہے۔ جوابِ دوست نسبتاً ایک مختصر تحریر ہے مگر اس کی زمانی، مکانی اور نظریاتی حدود بہت وسیع ہیں۔ اس کی قلمرو میں علی گڑھ کے علاوہ لکھنؤ، کلکتہ، لندن اور بن غازی شامل ہیں۔ کتاب کا ایک حصہ آزادی کے بعد کے حالات کے لیے وقف ہے۔ دوسرا آپ کے سوانحی واقعات پر مشتمل ہے۔ تیسرا ان نظریاتی مسائل سے تعلق رکھتا ہے جن کی عمر اتنی طویل ہے جتنی اسلام میں اختلافات ہو سکتی ہیں۔ جوابِ دوست میں وحدت الوجود، تصوف، خالق کا تصور، تخلیق کی نوعیت اور جبر وقدر جیسے مسائل کے ساتھ مسلمانوں کی تاریخ کے الجھے ہوئے واقعات اور موضوعات (بای ذنب، علمی جمود، گستاخانہ اشعار، زین آبادی) ہر صفحے پر بکھرے ہوئے ملیں گے۔ انہی سے کتاب میں تنوع اور رنگارنگی پیدا ہوتی ہے اور مصنف کے شوق اور ذوق کی گوناگونی کا پتا ملتا ہے۔"(16)

نسیم انصاری کی "جوابِ دوست" سے ایک شعر کا حوالہ دیتے ہوئے مختار مسعود نے طنز کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ مجھے شروع سے ہی پہیلی بوجھنے، بیت بازی جیتنے، معما حل کرنے، شطرنج کھیلنے اور تعلیمی تاش کی بازی لگانے سے شکایت رہی ہے۔ حوالہ جاتی شعر پر مختار مسعود نے تحقیق کی ہے اور اس پر علمی و ادبی لحاظ سے روشنی ڈالتے ہوئے اس کا درست مفہوم بھی بیان کیا ہے۔ مختار مسعود نے نسیم انصاری کے بیان کرتے واقعات کو مزید تحقیق کے ذریعے منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ نسیم انصاری اور مختار مسعود کے ایک استاد ماسٹر قاضی عبدالرشید سے متعلق ایک قصہ بیان کیا گیا ہے جس میں اورنگ زیب عالمگیر سے متعلق غلط روایات موجود ہیں۔ مختار مسعود نے اس روایت کو غلط ثابت کرنے کے لیے بہت سے دلائل اور واقعات پیش کیے ہیں۔ ظہر الدین فاروقی کی کتاب "اورنگ زیب اور اس کا عہد" سے مختار مسعود نے حوالہ بھی دیا ہے۔ مختار مسعود نے "داراشکوہ" پر بھی بحث کی ہے۔ "داراشکوہ" بنام عالم گیر تین سو سال پرانا مقدمہ ہے۔

نسیم انصاری کی کتاب "جوابِ دوست" میں اورنگ زیب کا ذکر دو مرتبہ کیا گیا ہے جن کے صفحات بھی مختار مسعود نے حوالہ کے طور پر لکھے ہیں۔ جس میں پہلی داستان ظالم و مظلوم کی اور دوسرا قصہ لیلیٰ مجنوں کا ہے۔ پھر مختار مسعود نے ابوالکلام آزاد کے خطوط کا ذکر کرتے ہوئے آخری خط سے متعلق بتایا ہے جس کو شائع نہ کیا گیا۔ اس خط میں آزاد نے اپنے موسیقی کے شوق کا اظہار کیا ہے۔ مختار مسعود نے موسیقی سے متعلق اپنے علم کو بیان کیا

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.6 No.4, 2023

ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختار مسعود وسیع المطالعہ انسان تھے۔ مختار مسعود نے اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کے دور کا ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر سے متعلق واقعات کی وضاحت بھی ساتھ ساتھ کرتے ہیں۔ غبارِ خاطر سے متعلق مختار مسعود لکھتے ہیں:

> "میرا خیال ہے کہ غبارِ خاطر کا آخری خط انشاء کی ساری خوبیوں کے باوجود ایک پھٹا ہوا غبارہ ہے۔ مولانا آزاد ہمیں داراشکوہ کے اس جملے تک تولے آتے ہیں جو اس نے باپ کو عالم گیر کی ریاکاری کے بارے میں لکھا تھا مگر یہ نہیں بتاتے کہ عالم گیر نے باپ کو ان شکایات کا کیا جواب دیا تھا۔ جس تفصیل سے مولانا آزاد نے عالم گیر اور زیب آبادی کے تعلقات کے بارے میں لکھا ہے اس کی روشنی میں یہ کہنا کہ عالمگیر کا جواب ان کے علم میں نہ تھا سراسر زیادتی ہوگی۔ اگر میرے جیسے ناقص علم والا شخص شاہ جہان کے استفسار پر لکھا ہوا اورنگ زیب کا جواب تلاش کر سکتا ہے تو یہ کام مولانا آزاد کہیں زیادہ آسانی سے کر سکتے تھے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ جواب ان کے علم میں تھا مگر انھوں نے اس کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ دیدہ زیب اور دل فریب عمارت جو انھوں نے اپنے قلم اور اپنی طبیعت کی روانی سے تعمیر کی تھی وہ عالمگیر کے جواب کے بعد بے بنیاد ثابت ہوتی۔ انھوں نے ایک سمجھ دار ڈرامہ نویس کی طرح وہ واقعہ ہی حذف کر دیا جو ڈرامے سے اس کی ساری ڈرامائی کیفیت کو سلب کر لیتا۔"(17)

"حرفِ شوق" کے اختتامیہ پر مختار مسعود کی اہلیہ عذرا مسعود نے کچھ معلومات دی ہیں۔ مختار مسعود کے ساتھ ساٹھ برس کی رفاقت کے بعد ان کی اہلیہ پر یہ فرض تھا کہ ان کی آخری تحریر کو کتابی شکل دینے میں اپنی خدمات پیش کر تیں۔ مذکورہ کتاب مختار مسعود کی وفات کے بعد شائع ہوئی جس میں پہلے صرف دو مضامین شامل کرنے کی تجویز تھی لیکن بعد میں باقی دو مضامین بھی شامل کر دیئے گئے۔ عذرا مسعود لکھتی ہیں کہ مختار مسعود کی شخصیت اور ان کے فن کی تفہیم کے لیے یہ چاروں مضامین نہایت اہم ہیں اور اگر ان مضامین کو کتاب میں شامل نہ کیا جاتا تو وہ مختار مسعود کی شخصیت کے ان گوشوں سے واقفیت نہ حاصل کر سکتے جو اس کتاب کے ذریعے قاری پر عیاں ہوتے ہیں۔ کتاب کا اختتام ایک فارسی شعر پر کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

1۔ مختار مسعود، حرفِ شوق، فائن بکس پرنٹرز، لاہور، 2021ء، ص:15
2۔ ایضاً، ص:21
3۔ ایضاً، ص:258،259
4۔ ایضاً، ص:263
5۔ ایضاً، ص:275،276
6۔ ایضاً، ص:281
7۔ ایضاً، ص:284،285
8۔ ایضاً، ص:292،293
9۔ ایضاً، ص:309
10۔ ایضاً، ص:319

11۔ ایضاً، ص:334

12۔ ایضاً، ص:356

13۔ ایضاً، ص:417

14۔ ایضاً، ص:469،468

15۔ ایضاً، ص:500

16۔ ایضاً، ص:516

17۔ ایضاً، ص:449